مولانا محمد اسحق صدیقی

علامہ بنوریؒ کی حمیّتِ دینی

انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اسے مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ عام رجحان یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کی زندگی کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے اسی پہلو پر نظر ڈالتا ہے جس سے اسے دلچسپی ہوتی ہے، یہ دلچسپی مقاصد و حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، اس لئے مختلف پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔

مثلاً آپ کسی تاجر کے یہاں کسی کاروباری معاملے کے سلسلہ میں جائیں تو آپ اس کی زندگی کے معاملاتی پہلو پر غائر نظر ڈالیں گے اور باقی گوشوں کو نظر انداز کردیں گے یا ان پر سرسری نظر ڈالیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ جب آپ اس کے پاس سے واپس آئیں تو آپ اس کی دیانت داری اور معاملات میں صفائی کے بارے میں پختہ رائے قائم کرچکے ہوں، مگر یہ نہ بتاسکیں کہ اس کا لباس کس قسم کا تھا؟

غیر اہم اور معمولی شخصیتوں کے متعلق تو عام لوگوں کا یہ طرز عمل بہت واضح ہے، مگر اہم اور غیر معمولی شخصیتوں کے متعلق بعض اوقات بعض لوگوں کا طرزِ عمل ذرا مختلف نظر آتا ہے۔ عام طور پر سمجھدار اور علم رکھنے والے افراد ایسی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں پر غور کے ساتھ نظر کرتے ہیں، تاہم اصولِ مذکور کا عمل کمزور ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے۔ عام طور پر سوانح نگاروں کا طریقہ آپ یہ پائیں گے کہ وہ شخصیت کے اسی پہلو کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں جس کی اہمیت اس کی نگاہ میں کسی وجہ سے زیادہ اور جس سے انہیں دلچسپی ہوتی ہے۔

محبّ محترم علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی بھی مختلف پہلو رکھتی ہے اور سب پہلو اچھے اور قابلِ تعریف تھے، میں نے اپنے سابق مضمون بعنوان ''یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی'' میں ان کی زندگی کے متعدد

گوشوں اور پہلوؤں پر اختصار واجمال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حضرات اپنے اپنے رجحان کے مطابق اس کی تفصیل بیان کریں گے، مگر میں اس وقت اپنے رجحان اور موضوع کی مخصوص اہمیت کے پیش نظر ان کی زندگی کے صرف اس گوشہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جونمایاں ہونے کے باجود اس اعتبار سے مخفی ہے کہ اس کی خوبی اور بلندی کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کے حصول کی کوشش کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ چیز ہے مولانا مرحوم کی ''حمیت دینی''۔

ذرا گردوپیش کے حالات پر نظر فرمایئے! قوم میں اس جنس گراں مایہ کی کتنی قلت ہے، اجتماعی اعتبار سے یعنی بحیثیت مجموعی قوم کے مزاج سے تو یہ چیز تقریباً رخصت ہوچکی ہے۔ قدرے قلیل جو باقی ہے وہ اس قدر کمزور ہے کہ ہماری حیات اجتماعی کو تقویت پہنچانے سے بالکل قاصر ہے، البتہ افراد ایسے موجود ہیں جن میں یہ روح پائی جاتی ہے، مگر ان کی تعداد قوم کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آج قوم میں دین ایسے ہی افراد کی وجہ سے باقی ہے، اس وصفِ عالی کی کمیابی اور مولانا مرحوم میں اس کی فراوانی میرے لئے ان کی زندگی کے اس پہلو کی طرف زیادہ کشش کا باعث ہوئی۔

بیدار مغزی اور شدّتِ احساس

علمائے کرام دین کے محافظ اور امت کے دینی سربراہ و نگران ہیں، اس منصب سے نہ تادم مرگ مستعفی ہوسکتے ہیں اور نہ کوئی انہیں معزول کرسکتا ہے۔ اس منصب کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیدار مغز ہوں اور ان کی دینی حس قوی ہو، وہ ہر وقت ہوشیاری کے ساتھ نظر کرتے رہیں کہ امت میں کوئی فتنہ تو نہیں پیدا ہورہا ہے اور فتنہ نظر آئے تو اس کا احساس انہیں شدت کے ساتھ ہونا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ فوراً اس کا سر کچلنے میں لگ جائیں۔ علمائے اہلسنت میں ایسے حساس اور بیدار مغز افراد کی بہت قلت محسوس ہوتی ہے۔ محبی علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ میں دونوں وصف امتیازی شان کے ساتھ موجود تھے۔ فتنہ کا احساس انہیں بہت جلد ہوجاتا تھا اور شدت احساس سے وہ بے چین ہوجاتے تھے۔ حمیت دینی کا جذبہ ان میں اس قوت وشدت کے ساتھ ابھرتا تھا کہ اس فتنہ کی سرکوبی کے بغیر انہیں چین نہ آتا تھا، انکارِ حدیث کا فتنہ پیدا ہوا تو مولانا مرحوم اس کے مقابلہ کے لئے سر بکف ہوگئے، زبان وقلم سے جو کچھ کرسکتے تھے، اس میں کوئی کوتاہی نہیں فرمائی۔ بہت سے علمائے کرام کو جھنجھوڑ کر اس کے مقابلہ کے لئے کھڑا کردیا۔ امت مسلمہ کی رہنمائی اور اس فتنہ شدیدہ سے اسے بچانے کے لئے خود بھی لکھا اور کہا اور دوسروں سے بھی لکھوایا اور کہلوایا۔ انگریزی طبقہ میں سے بھی خاصی تعداد کو اس کے خلاف صف آرا کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سیلابِ ضلال رک گیا اور فتنہ کا سانپ چوٹیں کھا کر ادھ موا ہوگیا۔

پاکستان میں مجدد کے فتنہ نے سر اٹھایا تو مولانا مرحوم و مغفور اس کی سرکوبی کے لئے فوراً مستعد ہوگئے اور بالآخر اسے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عظمت و محبت مولانا کے قلب میں بہت تھی اور ان کی شان میں بے ادبی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اخوان کے سید قطب نے جب سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخانہ تحریریں لکھیں تو موصوف بے چین ہوگئے، فوراً ان کی غلط بیانیوں اور گستاخیوں پر شدت کے ساتھ رد و انکار اور شدید غیظ و غضب کا اظہار فرمایا۔

مودودی صاحب کے افکار فاسدہ سے قوم کو بچانے کے لئے سختی کے ساتھ ان کی تردید فرمائی اور جب ان کی رسوائے عالم کتاب ''خلافت و ملوکیت'' شائع ہوئی تو مولانا مرحوم و مغفور کا غیظ و غضب اور بڑھ گیا اور آخر دم تک فتنہ مودودیت کے خلاف نبرد آزما رہے۔

مارشل لاء حکومت قائم ہونے کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت انہوں نے صرف اس لئے قبول کر لی تھی کہ اس راستہ سے اسلامی نظام کی منزل تک پہنچنے کا امکان ہے، اس لئے اس میں تعاون انشاء اللہ العزیز موجبِ اجر و رضائے الٰہی ہوگا۔ اس کے لئے بہت سی تجاویز احباب سے مشاورت کے بعد انہوں نے مرتب فرمائی تھیں، مگر افسوس ہے کہ کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے اسلام آباد کا یہ سفر، سفرِ آخرت ثابت ہوا۔

ان تجاویز میں مولانا مرحوم و مغفور نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے اور وہ اس تجویز کو بہت اہمیت دیتے تھے، معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد اس تجویز اور دیگر تجاویز کا کیا حشر ہوا؟ اسلامی نظریاتی کونسل میں شیعوں کی بے محل اور بے استحقاق نمائندگی کو دیکھتے ہوئے اس تجویز کے منظور ہونے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

اس عنصر کی موجودگی میں دوسری تجویزوں کی صحیح صورت اور افادیت کی بقاء بھی عادتاً غیر ممکن ہے۔ مولانا موصوف اگر موجود ہوتے تو شاید ان تجاویز خصوصاً تجویز متعلق صحابہ کرام علیہم الرضوان کی مناسب و مفید شکل میں منظوری کی توقع کی جاسکتی تھی۔ مگر اب تو:

''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''

ہی کہا جاسکتا ہے۔

فتنہ مرزائیت کی شدت کے بارے میں کچھ کہنا بے سود ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔ ان کی سراپا گمراہی افکار اور کفر آفریں عقائد اپنی فتنہ انگیزی اور ہلاکت آفرینی کے خود گواہ ہیں، یہ فتنہ یہود اور برطانیہ کا آفریدہ تھا اور انہی کی سرپرستی میں پھیلا۔ ان پڑھ، سادہ لوح افراد کے ساتھ دین سے جاہل مغرب زدہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان

بھی اس پرفریب فتنہ میں مبتلا ہونے لگے۔

حضرت مولانا مرحوم ومغفور کواس فتنہ کا بڑا شدید احساس رہا اور ساری عمر اسے مٹانے اور قوم کو اس سے بچانے کی کوشش میں لگے رہے، جب ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے امیر مقرر ہوئے تو مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو از سر نو اٹھایا اور اسے تحریک کی صورت میں ابھار کر زبردست جدوجہد کے بعد کامیابی سے ہمکنار کیا، مخلصانہ کوششوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نصرت وامداد سے نوازا اور مرزائیوں کو اسی حکومت نے بادل نخواستہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جو درحقیقت دل سے ان کی ہمدرد تھی اور مسلمانوں کے خون سے ان کی پرورش کررہی تھی۔

وسعتِ فکر

حفاظت واشاعتِ دین سے غفلت اہلسنت کی عام حالت ہے، مگر جن لوگوں کے دل میں دین کا درد ہوتا بھی ہے، ان میں بھی اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی نظر اس دائرے سے متجاوز نہیں ہوتی، جس میں وہ کوئی دینی خدمت انجام دے رہے ہوں، ان کی ایک دنیا ہوتی ہے اور ان کی فکری تگ ودو اسی تک محدود رہتی ہے، اس کے باہر دنیا میں دین کی مخالفت میں کیا ہو رہا ہے، دشمنانِ دین کہاں کہاں اور کن کن طریقوں سے حملے کررہے ہیں؟ یہ مسائل ان کے موضوعِ فکر سے بالکل خارج ہوتے ہین، یہ فکرِ محدود کسی طرح مناسب اور صحیح نہیں کہی جاسکتی اور اس سے امت کو بہت ضرر پہنچا اور پہنچ رہا ہے، مگر اسے کیا کہا جائے کہ ہمارے یہاں خادمانِ دین کی بڑی تعداد کا یہی حال ہے۔

تاہم ایک تعداد ایسے بے دار مغز اور باہوش علمائے کرام کی بھی ہے جو کسی مخصوص دینی خدمت میں انہماک کے باوجود حفاظت واشاعتِ دین کی فکر کو اسی تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کی فکر کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، دنیا میں جو فتنہ بھی دین کے خلاف پیدا ہوتا ہے، اس پر ان کی نظر جاتی ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں، اس قسم کے علمائے دین ہی درحقیقت دین کے محافظ اور امت کے نگران ہیں۔

اوپر کی سطروں میں فتنوں کا ذکر ہوا، اس کا مقابلہ جن علمائے کرام نے کیا، ان سب میں مندرجہ بالا وصف یعنی دین کی عام اور وسیع فکر مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔ علامہ بنوری مرحوم ومغفور میں یہ جوہرِ تاباں بہت نمایاں تھا، دنیا کے کسی حصہ میں دین کے خلاف کسی فتنہ کی اطلاع ملتی تو موصوف بے چین ہوجاتے اور اسے مٹانے کی کوشش کرتے۔ بطورِ مثال اس واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں کہ مولانا علیہ الرحمۃ کو انڈونیشیا میں فتنہ مرزائیت پہنچنے کی اطلاع ملی، تفصیل تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ مولانا نے وہاں کے بعض علمائے کرام سے رابطہ قائم کرکے مرزائیت پر

کتابیں بھیجیں اوراس موضوع پر اردو کی بعض کتابوں کا عربی ترجمہ کرنے کا بھی انتظام فرمایا۔

مولانا مرحوم ومغفور نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن بڑے اخلاص کے ساتھ قائم فرمایا اوراسے توکل کی طاقت سے چلایا' اخلاص اورللٰہیت کا اثر ہے کہ مدرسہ کو تعجب خیز مقبولیت اور کشش حاصل ہوئی ہے' تعجب خیز اس لئے کہ مدرسہ کو متعارف بنانے اور شہرت دینے کا ادنیٰ اہتمام بھی کبھی نہ کیا گیا، نہ آج کیا جاتا ہے، مگر باوجود اس کے' ممالک عربیہ، افریقہ، یورپ، امریکہ وغیرہ کے طلبہ خاصی تعداد میں موجود ہیں اور بہت سے فارغ ہوکر اپنے اپنے وطن یا کسی دوسرے مقام پر خدمتِ دین وعلمِ دین میں مصروف ہیں' مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حمیتِ دینی اس شعبہ میں بھی اپنا کام کرتی تھی۔

غیر ممالک کے طلبہ میں وہ دینی حمیت اور جذبۂ نصرت دین کی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور تعلیم وتذکیرہ کے ایسے طریقے اختیار فرماتے تھے کہ وہ لوگ جب واپس جائیں تو ذہنی وعلمی حیثیت سے فریضۂ نصرت دین کے لئے تیار اور جذبۂ حمیتِ اسلامی سے سرشار ہوں، تاکہ جہاں بھی جائیں اسلام کی اشاعت، اس کی نصرت اوراس کی طرف سے دفاع کا فریضہ اپنا حقیقی مقصدِ زندگی سمجھ کر انجام دیں۔

مناسب ہے کہ اس موقع پر اس اہم بات کا تذکرہ کردیا جائے جو علمائے کرام کے لئے مخصوص طور پر قابل توجہ ہے۔ اکثر وبیشتر یہی ہوتا ہے کہ جن حضرات میں حمیت دینی مناسب درجہ میں موجود ہوتی ہے' ان میں وسعتِ قلب مفقود ہوتی ہے' وہ مذہبی افکار میں ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کرسکتے اوراختلاف کے مدارج کو بالکل نظر انداز کردیتے ہیں' مجتہد فیہ اورفرعی مسائل میں اختلاف کے ساتھ ان کا معاملہ ایسا ہوتا ہے جو اسلام وکفر یا کم از کم سنت وبدعت کے اختلاف کے ساتھ ہونا چاہئے' مگر علامہ مرحوم میں یہ بات نہ تھی' باوجود حمیت دینی کی شدت کے وہ اختلافات کے مدارج کو خوب سمجھتے تھے اور ہر اختلاف کو وہی درجہ دیتے تھے جو شرعاً و عقلاً اسے حاصل ہونا چاہئے' ان کا قلب بہت وسیع تھا۔ فرعی اور مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف کو کبھی انہوں نے اصولی اختلاف کا درجہ نہیں دیا اور اصولی اختلافات میں بھی اصول کے مدارج وانواع کا لحاظ رکھا، اس کا عملی اثر یہ تھا کہ بکثرت ایسے لوگوں کے لئے بھی ان کے قلب میں وسیع جگہ تھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف رکھتے تھے' حمیت دینی کے وفور کے ساتھ اتنی وسعت قلبی بھی موصوف کا بہت قابلِ قدر وصف تھا۔ کاش وہ علمائے کرام بھی ان کے اس کمال کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش فرمائیں جو معمولی معمولی اختلافات میں حدود سے گزر جاتے ہیں اور انہیں اس سے بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں جن کے وہ شرعاً وعقلاً مستحق ہوتے ہیں۔